کچھ باتیں پروفیسر داؤد رہبر کی

[''عالمِ اسلام اور عیسائیت'' کے قارئین کے لیے پروفیسر ڈاکٹر داؤد رہبر کا نام اجنبی نہیں۔ اُن کی تحریر ''کلچر کے روحانی عناصر'' کے ایک حصے کی تلخیص اکتوبر ۱۹۹۴ء کی اشاعت میں پیش کی گئی تھی۔ پروفیسر صاحب مستقلاً فلوریڈا میں مقیم ہیں، انہیں پہلے دسمبر ۱۹۹۳ء میں اور پھر تین برس بعد نومبر- دسمبر ۱۹۹۶ء میں پاکستان آنے کا موقع ملا۔ یہاں کے دورانِ قیام میں اُنہوں نے وطنِ عزیز کے بعض معروف اداروں میں لیکچر دیے، احباب سے ملاقاتیں کیں، اُن کے ساتھ گئے وقتوں کی یادیں تازہ کیں، اور واپس ریاست ہائے متحدہ امریکہ تشریف لے گئے۔ اُنہوں نے اپنے سفر کی روداد ''تین ہفتے پاکستان میں'' کے عنوان سے لکھی ہے جو جناب مبین مرزا کے کتابی سلسلے ''مکالمہ'' (کراچی) کے دوسرے شمارے (بابت ۱۹۹۷ء) میں شائع ہوئی ہے۔

ذیل میں ڈاکٹر داؤد رہبر کی رپورتاژ کے وہ حصے مناسب عنوانات کے ساتھ بہ صد شکریہ نقل کیے جاتے ہیں جو اُن کے پسندیدہ موضوعات ـــــ تاریخ و ثقافت اور تقابلِ ادیان ـــــ سے تعلق رکھتے ہیں۔ جملہ حواشی خود پروفیسر ڈاکٹر داؤد رہبر کے مرقومہ ہیں۔ مدیر]

• ٹوئن بی کے فلسفۂ تاریخ میں بعض جذباتی باتیں

''دوسرے روز [۲ دسمبر ۱۹۹۳ء] فلوسوفیکل کانگرس کے زیرِ اہتمام پروفیسر قادر میموریل لیکچر--- کا عنوان تھا، 'ٹوئن بی کے فلسفۂ تاریخ میں بعض جذباتی باتیں'۔ لیکچر میں یہ عرض کیا گیا کہ باوصف وسعتِ علم پروفیسر ٹوئن بی کی فہم مذاہبِ عالم کے بارے میں سطحی ہے۔ اُنہوں نے اپنی

تصنیف 'مذہب ایک مؤرخ کے زاویۂ نظر سے'، اکی ایک عبارت میں رسول اکرمؐ کی ہجرت کا ذکر اہانت کے ساتھ کیا ہے۔ اسے فرار قرار دے کر اپنی کج فہمی اور کم ظرفی کا ثبوت دیا ہے۔ ہندومت کی تنقیص میں بھی موصوف کی فہم کی کوتاہی ظاہر ہے۔ ہندو اپنے دیوتا مہادیو شیو مہاراج کو تباہ کار کہتے ہیں، اس لیے کہ وہ کل جگ والی گندی دنیا کو تباہ کرتا ہے۔ پروفیسر ٹوئن بی نے پوری بات نہ سمجھی اور شیو مہاراج کو ایک بھوت قسم کی شخصیت جان لیا، حالانکہ شیو تو ایک جوگی مزاج دیوتا ہے اور ہندو مساکین کا ہر دل عزیز معبود ہے[۲]۔''

● مذاہب کا تقابلی مطالعہ: ''مغرب'' میں اور ہمارے ہاں

''جس آزاد خیالی کے ساتھ یورپ اور امریکہ کی یونیورسٹیوں میں مذاہب کا تقابلی مطالعہ کیا اور کرایا جاتا ہے، پاکستان تو کیا بھارت کی یونیورسٹیاں بھی ابھی اس کے لیے تیار نہیں ہیں۔ سارے بھارت میں صرف چنڈی گڑھ کی پنجابی یونیورسٹی میں ایک پروفیسری تقابلی تحقیقِ ادیان کی سکھوں کی ہمت سے قائم ہوئی ہے جو گورو گوبند سنگھ چیئر کہلاتی ہے۔ تقابلی چنے چبانا آسان نہیں۔ اس چیئر پر آج کل کون صاحب فائز ہیں اور مذاہب پر کس ذہنیت کے ساتھ لیکچر دیتے ہیں، مجھے معلوم نہیں۔ کاش چنڈی گڑھ جا سکوں اور ان کے چند لیکچر سن سکوں۔

بھارت کی کسی اور یونیورسٹی میں ایسی تقابلی کرسی موجود نہیں۔ اگر قائم ہو جائے تو سوال اٹھے گا کہ کرسی نشین کوئی پنڈت ہو یا مولانا۔ اس کرسی پر بیٹھ کر، کوئی پنڈت قرآن مجید اور انبیاء کرام علیہم السلام اور اولیاء کرام پر لیکچر دے یا کوئی مولانا ویدوں اور شاستروں اور اوتاروں اور بھگتوں پر بے لاگ لیکچر دیں، تصور میں نہیں آ سکتا۔

ادھر یورپ اور امریکہ میں نقشہ ہی اور ہے۔ مسیحی اور یہودی اور دہریے محققین بے باکی کے ساتھ شرقِ اوسط، ہندوستان، چین اور جاپان اور دیارِ مغرب کے مذاہب کی ریسرچ اور تدریس

میں مشغول ہیں۔ان میں سے کسی کسی پروفیسر کی تحقیق اور تدریس میں تعصب چور دروازے سے داخل ہو جاتا ہے، لیکن بہت سے روشن دماغ پروفیسر روادار بھی ہیں۔ بہرحال ذہنی آزادی کی فضا کے یہاں موجود ہونے سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔''

• لمس کے زیر اہتمام دیے گئے لیکچروں کے موضوعات

[پروفیسر داؤد رہبر نے نومبر- دسمبر ۱۹۹۶ء میں لمس (LUMS = Lahore University of Management Sciences میں سات لیکچر دیے تھے۔ پانچ لیکچر طلبہ و طالبات کے لیے تھے، اور دو میں عامۃ الناس کو شرکت کی اجازت تھی۔]

''ذریعہ تعلیم لمس کے تمام کورسوں میں انگریزی ہے۔ کلاس روم میں بحث اور سوال جواب سب انگریزی میں ہوتے ہیں۔--- میں نے بھی لیکچر سب انگریزی میں دیے۔ پہلے دو لیکچر ۳ میں لکھ کر لایا تھا، کیونکہ ان کے موضوع وسیع تھے اور مآخذ کے حوالوں کے بغیر ان پر کچھ کہنا ممکن نہ تھا اور اقتباسات ان دونوں میں لازم تھے۔ یہ لکھے ہوئے لیکچر میں نے کلاس کے آگے پڑھ دیے۔ باقی سارے لیکچر برجستہ دیے گئے۔

سات لیکچروں میں، میں نے کیا کہا، بالتفصیل بتانے لگوں تو کہانی کی بڑھت میں رکاوٹ ہوگی۔ بہتر یہ ہے کہ ان لیکچروں کا ایک کتابچہ الگ بنے۔ تاہم اجمال کے ساتھ اتنا بتا دینا برمحل ہو گا کہ لیکچروں کے موضوع کیا سوچ کر چُنے گئے۔

پہلا لیکچر: یہ لیکچر بادشاہی دور پر تھا۔ اس کا منشا یہ بتانا تھا کہ بادشاہی دور میں شائستگی کے گہوارے بعض منور بادشاہوں کے دربار تھے۔ وہ دور ختم ہوا تو خود بدولت لوگ اب سیٹھ ہی رہ گئے ہیں۔ سیٹھ خود شائستہ نہ ہوں گے تو شائستگی کی پاسبانی کیسے کریں گے؟

دوسرا لیکچر: اس کا عنوان تھا--'ہمارے زمانے میں جمہوری اقدار اور شاہانہ اقدار کا خلط ملط'۔ یہ الجھاؤ تو آج دنیا بھر کے ممالک کی معاشرت کے ہیں۔ خود ہندوستان اور پاکستان میں ان کے شواہد ہمارے سامنے ہیں۔ پچاس منٹوں کے لیکچر کے لیے میں نے گزشتہ سو سال کی تاریخِ ایران کو بہ طور مثال چنا۔ بیسویں صدی کے آغاز (۱۹۰۵ء تا ۱۹۰۹ء) میں محمد علی شاہ قاجار نے ایران کے جمہوری انقلاب سے کس ہٹ دھرمی کے ساتھ جنگ لڑی اور کس بے شرمی سے مجلسِ ملّی کے بنائے ہوئے آئین کی اہانت کی اور کیسے قاجاریوں کے بعد دو پہلوی شاہوں نے مجتہدین کی جمہوری سپرٹ کا زور توڑنے کو اہلِ ایران کے دلوں میں آریائی جذبہ ابھارنے کی کوشش کی اور قرآن مجید کو بالائے طاق رکھنے اور اس کی بجائے 'شاہ نامہ' کی تلاوت کا سبق دیا۔

تیسرا لیکچر: عالمی مذاہب جن آزمایشوں سے گزر رہے ہیں، اس لیکچر میں ان کا بیان منظور تھا۔ آبائی دین سے اہلِ روس اور اہلِ چین کی برگشتگی، اتاترک کی قیادت میں تعلیم یافتہ ترکوں کا دین سے بے زار ہو جانا، یورپ اور امریکہ میں رندانہ اطوار کی وبا اور وہاں مسیحیت سے برگشتہ طبقات میں ہندوؤں کے اساطیر اور گوتم بدھ کی دہریت کی مقبولیت، ذہنی بیماریوں اور ان کے معالج نفاس[۴]، نفاسوں کے اندازِ فکر کا زور پکڑنا، منشیات کے استعمال کی وبا، گرہست کے احترام کا تنزل۔

چوتھا لیکچر: اس سے یہ جتانا منظور تھا کہ عظیم شخصیتوں کی خوبی کردار کے اعلان تو چار سو ہوتے رہتے ہیں، لیکن ان غیر معروف اشخاص کے حسنِ اخلاق کا اعتراف کم ہی ہوتا ہے جن کے دم سے محلے کی برکت ہوتی ہے۔ جمہوری زمانے میں یہ تغافل افسوس ناک ہے۔

پانچواں لیکچر: اس میں، میں نے لمس کے طلبہ کی توجہ آدابِ محفل اور فنِ گفتگو کی اہمیت کی طرف دلائی اور اپنی رائے کا اظہار کیا کہ آدابِ محفل اور فنِ گفتگو اسلامی فنونِ لطیفہ میں سرفہرست ہیں۔ تعلیم صرف کمپیوٹر اور ٹیکنالوجی کی ہو تو یہ ہنر حاصل نہیں ہوتے۔ دیکھ لینا ٹیکنالوجی تمہیں تھکا دے گی۔ دردِ سر کے حال میں انسان اچھی گفتگو پر قادر نہیں ہوتا۔ ٹیکنالوجی میں الجبرا بہت ہے۔ عمر خیام

الجبرا کا ماہر تھا، الجبرا کی ورزش کے ساتھ رباعیاں کہنے کا لطف بھی اٹھاتا تھا۔ ادبیات اور موسیقی سے لگاؤ رکھو کہ طبیعتوں میں شگفتگی بھی رہے اور صحبتِ دوستاں میں بور ہونے سے بچے رہو۔ اچھی تفریح شائستہ گفتگو سے حاصل ہوتی ہے اور شخصیت میں دلکشی اسی سے آتی ہے۔

دو پبلک لیکچر

چھٹا لیکچر: اس میں سوانح عمریوں کی اہمیت جتائی گئی۔ کسی بزرگ کی سوانح عمری پڑھنے سے اس بزرگ کی روح سے رابطہ قائم ہوتا ہے۔ متعدد سوانح عمریاں پڑھنے سے ذہن آباد ہو جاتا ہے۔ ناول اپنی جگہ ہے، لیکن ناول خوانی اور سیرت خوانی کی نفسیات اپنی اپنی ہیں۔ افسانوی کرداروں کے بارے میں قاری کا شعور پوچھتا رہتا ہے، کس حد تک یہ کردار من گھڑت ہیں اور کسی حد تک حقیقی۔ اور یہ کہ کہانی میں افسانہ نویس نے احوالِ واقعی میں احوالِ خیالی کی ملاوٹ کتنی کی ہے؟ افسانہ میں احوالِ واقعی کتنی ہی صداقت سے کوئی لکھنے والا بیان کرے، یہ بہرحال ''نام بدل'' کہانی رہے گا۔ 'گئودان' کے ہوری کی روح سے ہمارا رابطہ محکم بنیاد پر کیسے ہو جب کہ ہمارا من کہتا رہے گا، ہوری ایک خیالی کردار ہے۔ سوانح عمری پڑھتے ہوئے سیرت سے شناسائی کا عالم اور ہوتا ہے۔ سیرت اس میں ٹھکی ہوئی حقیقت ہو کر تجربے میں آتی ہے۔ ہوری نام کا ایک کسان اگر ایک فرضی شخص نہ ہوتا اور منشی پریم چند اس کی سوانح عمری لکھتے تو اس سوانح عمری کو پڑھ کر ہماری دوستی ہوری کی روح سے ہو جاتی۔ فرضی شخص کی روح بھی فرضی ہوگی اور فرضی روح سے ہماری دوستی بھی فرضی ہی رہے گی۔

ساتواں لیکچر: آفرینشِ کائنات اور حیات بعد ممات کے تصورات بڑے بڑے مذاہب میں کیا ہیں؟ اس لیکچر میں مختصراً اِس سوال کا جواب پیش کیا گیا۔''

• نیشنل کالج آف آرٹس میں ایک لیکچر

[پروفیسر داؤد رہبر کے اِس لیکچر کا موضوع تھا ''بعض انگریز اور امریکی اسکالروں کے مزاجوں کا پتا اُن کی تصانیف میں'']

''پروفیسر ولفرڈ سمتھ[۵] کے ذکرِ خیر سے بات شروع کی۔ ان سے کئی برس میرا میل جول رہا۔ یہ ایک پادری کے بیٹے ہیں۔ ۱۹۱۶ء میں کینیڈا میں پیدا ہوئے۔ ہارورڈ یونیورسٹی سے ریٹائر ہو کر اب کینیڈا کے شہر ٹورنٹو میں رہتے ہیں۔ آغازِ شباب میں یہ علی گڑھ کی ہنری مارٹن انسٹی ٹیوٹ[۶] اور لاہور کے فورمن کرسچن کالج سے لیکچرار کی حیثیت سے وابستہ رہے۔ ماڈل ٹاؤن کے ایف بلاک میں چار سال مقیم رہے۔ اُنہوں نے علی گڑھ اور لاہور میں اردو سیکھی۔ ایف-سی کالج کے استاد فرزند علی صاحب سے 'مسدس حالی' کا سبق لیا۔ ہمارے دیس کی آزادی سے ذرا پہلے ان کی تصنیف 'دورِ جدید میں ہندی مسلمانوں کا اسلام' لاہور کے ایک مطبع[۸] سے چھپی۔ یہ کتاب مارکسی نقطۂ نظر سے لکھی گئی۔ ایک گفتگو میں سمتھ صاحب نے مجھے بتایا کہ اپنے لڑکپن کے دنوں میں کینیڈا کے بعض نوجوانوں کی مارکسی تحریک سے متاثر ہو کر یہ مارکسی ہو گئے تھے۔

ہنری مارٹن انسٹی ٹیوٹ اور فورمن کرسچن کالج مشنریوں کے ادارے تھے۔ سمتھ صاحب مشنری تنظیم کے بھیجے ہوئے ہندوستان آئے تھے۔ جب ان کی کتاب سے مشنریوں کو مارکسی خیالات کا علم ہوا تو فورمن کرسچن کالج میں ان کی لیکچراری کا خاتمہ ہوا۔ امریکہ پہنچ کر مصر کی صحافت سے متعلق مقالہ لکھ کر اُنہوں نے پرنسٹن یونیورسٹی سے پی-ایچ-ڈی کی سند حاصل کی، پھر کینیڈا کی میکگل یونیورسٹی کے شعبہ الٰہیات میں پروفیسر ہو گئے۔ اس یونیورسٹی میں انہوں نے اسلامیات کی انسٹی ٹیوٹ کی بنیاد ڈالی، یہ ان کا بڑا کارنامہ ہے۔

چند سال بعد یہ ہارورڈ یونیورسٹی کے ادارۂ تحقیقاتِ مذاہب عالم۹ کے ڈائریکٹر مقرر ہوئے۔ اس منصب کے فرائض سے ان کی دلچسپیوں میں تبدیلی آئی۔ اسلامیات سے ان کا جو خاص تعلق پہلے تھا برقرار نہ رہا، سارے مذاہب کی شناسائی لازم ہوئی۔ ہندومت اور بدھ مت سے مانوس ہونے لگے۔

ان کی بیشتر نگارشوں کا مقصد قارئین کو اس بات سے خبردار کرنا ہے کہ مذہب جامد نہیں ہوتے، عہد بہ عہد نئے رنگ لاتے رہتے ہیں۔ چنانچہ یوں بات کرنا کہ اسلام یوں کہتا ہے اور ہندو مت یوں کہتا ہے اور بدھ مت یوں کہتا ہے اور مسیحیت یوں کہتی ہے، بے معنی ہے۔ دیکھنا یہ چاہیے کہ فلاں عہد کے اور فلاں ملک کے مسلمان یا ہندو یا مسیحی کیا کہتے ہیں اور فلاں مسلمان کا دل کیا کہتا ہے اور فلاں ہندو کا دل کیا کہتا ہے اور فلاں مسیحی کا دل کیا کہتا ہے۔ اصول تو سمتھ صاحب کا معقول ہے، لیکن ان کے لکھے ہوئے مباحث میں مثالوں کا فقدان ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کا علم کتابی رہا اور ان کے مراسم دوسری ملتوں کے خواص وعوام سے نہایت محدود رہے، پھر مثالوں کے لیے حکایات کہاں سے آتیں؟

ان کی نگارشات میں آزاد خیالی کی تبلیغ ہے۔ عمر بھر یہ چین کے متلاشی رہے، لیکن ان کا یہ اضطراب دور نہ ہوا۔ لڑکپن میں یہ مارکسی ہوئے اور آگے چل کر مارکسی خیالات سے ان کا جی اچاٹ ہوا۔ سرکشی ان کی طبیعت میں تھی، لیکن یہ رند نہ ہو پائے۔ پادری کے بیٹے تھے، مزاج زاہدانہ اور ناصحانہ رہا، بذلہ سنجی نہ آئی۔ کوئی ہم نشیں لطیفہ سنا کر انہیں ہنسائے تو ہنستے ہیں، خود لطیفہ کبھی نہیں سناتے۔

ارادہ تو تھا کہ سمتھ صاحب کے تذکرے کے بعد اسلامیات کے اور دو تین اسکالروں سے تعارف کراؤں، لیکن سمتھ صاحب کے تذکرہ میں بیس منٹ لگ گئے۔ باقی آدھ گھنٹے میں، میں نے سامعین کو اپنی بعض گفتگوؤں کی یاد میں شریک کیا جو بعض اسکالروں سے ہوئیں۔ بہ طور مثال

صرف ایک گفتگو یہاں دہراتا ہوں۔

امریکن اکیڈمی آف آرٹس اینڈ سائنسز کا ایک سالانہ اجلاس بوسٹن میں ہوا۔ اس کے ایک رکن نے مجھے اس اجلاس میں مہمان کی حیثیت سے شرکت کی دعوت دی۔ اجلاس میں علم الانسان[1] کے ماہر پروفیسر کلی فورڈ گی ارٹز[2] صاحب کا لیکچر جاوا کے مسلمانوں کے بارے میں ہوا۔ انہوں نے جاوا جا کر وہاں کی معاشرت کا جائزہ لیا تھا اور اپنے مشاہدات قلم بند کر کے ایک کتاب شائع کی تھی جس سے خوش ہو کر اسی سال اکیڈمی نے انہیں ایک خاص اعزاز سے نوازا تھا۔

اس لیکچر میں انہوں نے کہا کہ امریکہ میں تو فرد کا مرتبہ اس کے کسبِ کمال اور کارگزاری سے متعین ہوتا ہے، لیکن جاوا کے مسلمانوں میں ایسا نہیں ہے۔ وہاں تعین اس حساب سے ہوتا ہے کہ تم شیوخ کی اولاد سے ہو یا سادات ہو یا چودھریوں کے خاندان سے ہو یا حکیموں کی نسل سے ہو یا قاضی کے پڑپوتے ہو، یعنی اپنے مورثوں کی بڑائی جتا کر وہاں فرد اپنی حیثیت بناتا ہے۔

ان کے لیکچر کے بعد سوال جواب ہوئے تو میں نے اُٹھ کر کہا۔ اس لیکچر میں اندھی تعمیم ہے۔ ایسا حساب کسی بھی معاشرے میں نہیں ہوسکتا۔ محلے میں یا پورے قصبے میں فرد کی حیثیت اس کے کردار سے بنتی ہے۔ وہ دیانت دار ہے یا بددیانت، ملنسار ہے یا روکھا، ہنس مکھ اور شگفتہ ہے یا رونی صورت، مہمان نواز ہے یا مردم بےزار، کنبہ پرور ہے یا غیر ذمہ دار، ذی علم ہے یا انجان، دلیر ہے یا بزدل، خوب رو ہے یا سادہ رو، خوش گفتار ہے یا بے مزہ گفتگو کرتا ہے وغیرہ۔ جاوا کا معاشرہ اس سے مستثنیٰ کس طرح ہوسکتا ہے۔''

حواشی

1- A Historian's Approach to Religion

۲- یہ مقالہ انگریزی میں ہے۔ ادارہ ثقافتِ اسلامیہ (لاہور) کے رسالہ ''المعارف'' میں چھپ چکا

ہے۔(جنوری-مارچ ۱۹۹۴ء)

۳-ان کے عنوانات یہ تھے:

Life in the days of Monarchy

The Confusion of Monarchical and Democratic Values in Our Time

4- Psychiatrist.

5- Wilfred Cantwell Smith

6- Henry Martyn Institute of Islamic Studies.

7- Modern Islam in India

8- Civil and Military Gazette Press, Lahore.

9- Center for the Study of World Religions

10- Anthropology

11- Clifford Geertz